سیدنا عیسیٰ الٰہ تھے، یا نبی؟
سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی

اور عیسائیوں کے شبہات کی تفصیلی وضاحت

مولانا خاور رشید بٹ [1]

جناب مسیح علیہ السلام کا خود کے بارے میں دعوائے نبوت نہ کہ دعوائے اُلوہیت!

① قرآن مجید نے تو واضح الفاظ میں مسیح علیہ السلام کے رسول ہونے کی صراحت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝﴾ [المائدۃ:۷۵]

''مسیح ابن مریم ایک رسول ہی تھے، جن سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں اور اس کی والدہ راست باز تھی۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھئے ہم ان کے لیے کیسے واضح دلائل پیش کر رہے ہیں پھر یہ بھی دیکھئے کہ یہ لوگ کدھر سے بہکائے جا رہے ہیں؟''

② اور یہ بھی مکالمہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝﴾ [المائدۃ:۱۱۶-۱۱۷]

''جب (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری والدہ کو الٰہ بنالو۔'' حضرت عیسیٰ جواب دیں گے: ''اے اللہ! تو پاک ہے، میں ایسی بات کیونکر کہہ سکتا ہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا۔ کیونکہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہ تو تو جانتا ہے لیکن جو تیرے دل میں ہے وہ میں نہیں جان سکتا۔ تو تو چھپی ہوئی باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔ میں نے تو انہیں صرف وہی کچھ کہا تھا

[1] ریسرچ سکالر حقوق الناس فاؤنڈیشن، لاہور… استاذ جامعہ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ)، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی اور جب تک میں ان میں موجود رہا، ان پر نگران رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو پھر تو ہی ان پر نگران تھا۔ اور تو تو ساری چیزوں پر شاہد ہے۔"

③ بائبل کا عہد جدید بھی اس پر گواہی دیتا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے، جانیں۔"[1]

④ اس اردو کی جب ہم عربی دیکھتے ہیں تو یوں لکھی ہوئی ملتی ہے:

والحياة الأبدية أن يعرفوك أنت الإله الحق وحدك ويعرفوا يسوع المسيح الذى أرسلته[2] اگر حضرت مسیح علیہ السلام خود ہی خدا تھے تو یہ بات کس سے کر رہے تھے؟

⑤ آپ مبعوث (بھیجے گئے) تھے اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ بھیجنے والا اور بھیجا گیا دونوں میں فرق ہوتا ہے۔

⑥ تثلیث اور اقانیم کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز کچھ نہ جانتے تھے۔

⑦ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُلوہیت کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا کیونکہ اُنہوں نے الٰہ حقیقی ہونے کی نسبت دوسری ذات کی طرف فرمائی ہے نہ کہ اپنی طرف۔

⑧ پس یسوع نے کہا کہ "جب تم ابن آدم کو اونچے پر چڑھاؤ گے تو جانو گے کہ میں وہی ہوں اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا بلکہ جس طرح باپ نے مجھے سکھایا، اسی طرح یہ باتیں کہتا ہوں اور جس نے مجھے بھیجا وہ میرے ساتھ ہے، اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا کیونکہ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند آتے ہیں، جب وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا تو بہتیرے اس پر ایمان لائے۔"[3]

کوئی بھی انسان تعصّب کی عینک اتار کر بتا سکتا ہے کہ یہ جملے سن کر ایمان لانے والوں کا ایمان کیسا ہو گا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بذاتِ خود خدا ہیں اور وہ مدعی الوہیت تھے یا کہ الٰہ کوئی دوسرا ہے اور یہ اس کی طرف سے بھیجے گئے ایک رسول اور نبی تھے؟

⑨ انجیل لوقا کا مصنف حضرت مسیح علیہ السلام کے حوالے سے نقل کرتا ہے کہ "انھوں نے یسعیاہ نبی کا صحیفہ پڑھ کر یہودیوں کو سنایا: خداوند کا روح مجھ پر ہے، اس لیے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کے لیے

---

۱ انجیل یوحنا ۱۷:۳

۲ Arabic Bible, GNA 083 ۳ انجیل یوحنا ۸:۲۸-۳۰

مسح کیا، اس نے مجھے بھیجا ہے کہ قیدیوں کو رہائی اور اندھوں کو بینائی پانے کی خبر سناؤں، کچلے ہوؤں کو آزاد کروں اور خداوند کے سالِ مقبول کی منادی کروں، پھر وہ کتاب بند کر کے اور خادم کو واپس دے کر بیٹھ گیا اور جتنے عبادت خانے میں تھے، سب کی آنکھیں اس پر لگی تھیں۔ وہ ان سے کہنے لگا کہ آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا ہے اور سب نے اس پر گواہی دی۔"[1]

جناب مسیح علیہ السلام نے یسعیاہ نبی کی یہ پیشین گوئی اپنے حق میں قرار دی ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نبی اور رسول تھے، نہ کہ خدا تھے۔

مزید تائید ایسے ہوتی ہے کہ یسعیاہ نبی کی کتاب آج بھی بائبل میں موجود ہے اور اس سے ملتی جلتی عبارت موجود[2] ہے لیکن کسی یہودی نے یہ نہیں سمجھا کہ جس پر یہ صادق آئے گی، وہ خدا ہو گا۔

⑩ کسی بیوہ کا اکلوتا بیٹا مر گیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) زندہ کیا، آگے لکھا ہے:

"سب پر دہشت چھا گئی اور وہ خدا کی تمجید کر کے کہنے لگے کہ ایک بڑا نبی ہم میں برپا ہوا ہے اور خدا نے اپنی اُمّت پر توجہ کی ہے اور اس کی نسبت یہ خبر سارے یہودیہ اور تمام گردونواح میں پھیل گئی۔"[3]

اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے باوجود حاضرین نے انھیں خدا نہیں بلکہ نبی سمجھا اور تمام علاقے میں بھی یہ بات معروف ہو گئی۔ ایسے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام واضح کر سکتے تھے کہ میں خدا ہوں اور تم مجھے نبی سمجھ رہے ہو۔ ان کی خاموشی کونسی بات بتا رہی ہے؟ ہر زیرک شخص سمجھ سکتا ہے۔

⑪ معاشرے میں ان کی شہرت بطورِ نبی تھی، اس کی تائیدیوں بھی ہوتی ہے کہ ایک فریسی[4] یہودی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی، کھانے پر بیٹھے تو ایک بد چلن عورت آ کر ان کے قدموں میں گر پڑی، روئی، اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے جناب مسیح علیہ السلام کے پاؤں کو اپنے بالوں سے پونچھا اور ان پر عطر ڈالا اور بہت چوما۔ آگے لکھا ہے: "اس کی دعوت کرنے والا فریسی یہ دیکھ کر اپنے جی میں کہنے لگا: اگر یہ شخص نبی ہوتا تو جانتا کہ جو اسے چھوتی ہے، وہ کون اور کیسی عورت ہے کیونکہ وہ بد چلن ہے۔"[5]

جناب مسیح علیہ السلام کا دعویٰ اُلوہیت کا ہوتا تو اس فریسی یہودی کو ان کے الٰہ ہونے میں شک گزرنا چاہیے تھا، نہ کہ نبی ہونے پر۔

⑫ عہد جدید میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے مرنے اور پھر جینے کا تذکرہ ہے، دو آدمی آپس میں باتیں کرتے جا رہے

---

۱ انجیل لوقا ۴:۱۸-۲۲
۲ دیکھیں ۶۱:۱-۲
۳ انجیل لوقا ۷:۱۶-۱۷
۴ یہودیوں کا کٹر فرقہ
۵ انجیل لوقا ۷:۳۶-۳۹

تھے، ان میں سے ایک ان کا پیروکار تھا اور اس کا نام کلیپاس تھا، حضرت مسیح علیہ السلام خود زندہ ہونے کے بعد ان کے پاس آ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ان کی آپس کی باتوں کے متعلق پوچھا تو انھوں نے اس سے کہا: یسوع ناصری کا ماجرا جو خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا...۔"[1]

کلیپاس کے پیروکار ہونے کی صراحت بائبل کی مطالعاتی اشاعت والوں نے کی ہے۔[2]

واضح ہوا کہ جناب مسیح علیہ السلام کے ساتھ واقعہ صلیب کے بعد تک بھی ان کے پیروکار انہیں ایک نبی و رسول کی حیثیت سے ہی جانتے اور مانتے تھے۔

⑬ جناب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک فقیر پیدائشی اندھے کی بینائی لوٹائی تو بعد میں اس کو فریسی یہودیوں کے پاس لے جایا گیا، انھوں نے پھر اس اندھے سے کہا کہ اس نے جو تیری آنکھیں کھولیں تو اس کے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: "وہ نبی ہے۔"[3]

بعد میں اس آدمی اور یہودیوں کے مابین جناب عیسیٰ علیہ السلام کے سچے ہونے پر مناظرہ ہوا تو اس نے اپنی بینائی کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہوئے کہا:

"دنیا کے شروع سے کبھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی نے جنم کے اندھے کی آنکھیں کھولی ہوں، اگر یہ شخص خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو کچھ نہ کر سکتا۔"[4]

واضح ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں اور یہودیوں کے مابین بحث مباحثہ بھی دعویٰ نبوت پر ہوتا تھا، نہ کہ دعویٰ اُلوہیت پر۔

⑭ اور جب وہ یروشلیم میں داخل ہوا تو سارے شہر میں ہل چل پڑ گئی اور لوگ کہنے لگے: یہ کون ہے؟ بھیڑ کے لوگوں نے کہا: "یہ گلیل کے ناصرۃ کا نبی یسوع ہے۔"[5]

اس موقع پر جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کے شاگرد بھی تھے لیکن نہ تو انھوں نے اور نہ ہی کسی شاگرد نے اس پر کوئی تنقید کی۔

⑮ تقریباً پانچ ہزار افراد کو معجزہ کے طور پر تھوڑا سا کھانا پورا ہو گیا تو وہاں موجود سب لوگ کہنے لگے، جبکہ مسیح علیہ السلام اور ان کے شاگرد بھی وہاں موجود تھے:

---

۱ انجیل لوقا ۲۴:۱۳-۲۰

۲ تفسیر بائبل بنام مطالعاتی اشاعت ص ۱۹۰۹، ناشر بائبل سوسائٹی پرانی انارکلی، لاہور

۳ انجیل یوحنا ۹:۱۷

۴ انجیل یوحنا ۹:۳۲-۳۳

۵ انجیل متی ۲۱:۱۰-۱۱

"پس جو نبی دنیا میں آنے والا تھا، فی الحقیقت یہی ہے۔"[1]

⑯ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کے علاقے ناصرۃ کے لوگ ان کے معجزات دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لائے تو فرمانے لگے:

"نبی اپنے وطن اور اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا۔"[2]

⑰ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو آکر جب بعض فریسیوں نے ڈرایا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ کیونکہ ہیرودیس تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے جواب دیا: اس لومڑی سے کہہ دو کہ دیکھ میں آج اور کل بدروحوں کو نکالتا اور شفا بخشنے کا کام انجام دیتا رہوں گا اور تیسرے دن کمال کو پہنچوں گا مگر آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلیم سے باہر ہلاک ہو۔"[3]

⑱ اپنے شاگردوں کو فرمانے لگے:

"جو تم کو قبول کرتا ہے وہ مجھے قبول کرتا ہے اور جو مجھے قبول کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو قبول کرتا ہے۔ جو نبی کے نام سے نبی کو قبول کرتا ہے، وہ نبی کا اجر پائے گا۔"[4]

⑲ جناب عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزات کے سبب معاشرے میں کافی مشہور ہو گئے یہاں تک کہ ہیرودیس بادشاہ تک ان کے چرچے پہنچ گئے۔ ان معجزوں کی وجہ سے لوگوں میں کیا چہ مگوئیاں ہوتی تھیں، ملاحظہ فرمائیں:

"اور ہیرودیس بادشاہ نے اس (مسیح) کا ذکر سنا کیونکہ اس کا نام مشہور ہو گیا تھا اور اس نے کہا کہ یوحنا بپتسمہ دینے والا مردوں میں سے جی اُٹھا ہے، اس لیے اس سے معجزے ظاہر ہوتے ہیں، مگر بعض کہتے تھے کہ ایلیاہ ہے بعض یہ کہ نبیوں میں سے کسی کی مانند ایک نبی ہے مگر ہیرودیس نے سن کر کہا کہ یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) جس کا سر میں نے کٹوایا، وہی جی اٹھا ہے۔"[5]

یہ ایک فطری بات ہے کہ کسی بھی انسان کا روحانی مرتبہ زیادہ سے زیادہ نبی تک جا سکتا ہے، اس لیے تمام لوگ جناب مسیح علیہ السلام کو نبی کی مانند یا نبی ہی خیال کرتے تھے۔ کسی ایک انسان نے بھی ان کی زندگی میں ان کو خدا نہیں سمجھا۔

⑳ ایک عورت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اس کی مخفی زندگی کا چہرہ کروایا تو کہنے لگی:

---

۱ انجیل یوحنا ۶:۱۴
۲ انجیل متی ۱۳:۵۷
۳ انجیل لوقا ۱۳:۳۱-۳۴
۴ انجیل متی ۱۰:۴۰-۴۱
۵ انجیل مرقس ۶:۱۴-۱۶

"مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تو نبی ہے۔"[1]

مسیح علیہ السلام نے اس عورت کو غلط نہیں کہا اور نہ ہی اس کی تصحیح کرتے ہوئے، اپنے آپ کو خدا بتایا۔

(۲۱) عید کے آخری دن عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو تبلیغ کی تو ان کی باتیں سن کر وہاں موجود لوگوں نے ان کی حیثیت متعین کرنے میں اختلاف کیا۔ لکھا ہے: "پس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا: بے شک یہی وہ نبی ہے، اوروں نے کہا: یہ مسیح ہے اور بعض نے کہا: کیوں؟ کیا مسیح گلیل سے آئے گا؟ کیا کتاب مقدس میں یہ نہیں آیا کہ مسیح داود کی نسل اور بیت لحم کے گاؤں سے آئے گا، جہاں داود تھا، پس لوگوں میں اس کے سبب اختلاف ہوا، اور ان میں سے بعض اس کو پکڑنا چاہتے تھے مگر کسی نے اس پر ہاتھ نہ ڈالا۔"[2]

عیسیٰ علیہ السلام اگر خدا ہوتے تو ایسے موقع پر اپنی حیثیت واضح کر کے لوگوں کا اختلاف دور کر سکتے تھے، لیکن ایسا نہیں کیا، معلوم ہوا ان کی حکمت بھری گفتگو سن کر لوگ انہیں نبی اور مسیح ہی خیال کرتے تھے، نہ کہ خدا۔

مسیحی ردِّ عمل

یہ اور اس طرح کے دیگر دلائل جب پیش کیے جاتے ہیں تو مسیحی حضرات ان کا جواب یوں دیتے ہیں:

جناب مسیح کی دو حیثیتیں ہیں: ایک انسانی دوسری الوہی! آپ ایک کامل انسان بھی ہیں اور کامل خدا بھی، لہٰذا یہ جتنے بھی دلائل ہیں، ان سب میں ان کی انسانیت کا روپ ہے یعنی بطورِ انسان یہ کام ان سے صادر ہوئے۔

جواب

① اصل جواب سے پہلے یہ حوالہ فائدہ سے خالی نہیں ہو گا کہ ۳۲۵ء کی 'نقایہ کونسل' میں ہی کلیسیا نے فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ نجات دہندہ (مسیح) کی ذات بابرکات میں خدائی اور انسانی اوصاف کاملیت کے ساتھ موجود ہیں۔[3] معلوم ہوا کہ ابتدا سے ہی مسیحی لوگ جناب عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت میں مختلف اعتقاد رکھتے تھے، اسی لیے تو ان کو سرکاری طور پر اس کا اعلان کرنا پڑا، مزید یہ کہ آج تک عیسائیوں میں ایسے فرقے چلے آتے ہیں جو جناب عیسیٰ علیہ السلام کی صرف ایک حیثیت یعنی انسانی کے قائل ہیں، ان کو خدا تسلیم نہیں کرتے جیسا کہ یونی ٹیرین فرقہ ہے۔ اگر دو حیثیتوں والا نظریہ حقیقی ہوتا تو ابتدا سے لے کر آج تک دو ہزار سال گزرنے کے باوجود اختلافی نہ رہتا۔

② جناب مسیحی علیہ السلام نے کبھی اپنی دو حیثیتوں کا دعویٰ نہیں کیا یہ تو مدعی سست اور گواہ چست والا معاملہ ہے۔

---

۱ انجیل یوحنا ۴: ۱۹ ۲ انجیل یوحنا ۷: ۴۰-۴۴

۳ مسلم سوالات مسیحی جوابات: ص ۱۵۶ از کرسچین ٹرال، طبع اول ۲۰۱۲ء، ناشر ملٹی میڈیا افیئرز لاہور

بلکہ اس کے برخلاف بائبل واضح اور صاف الفاظ میں خدا تعالیٰ کا یہ قول نقل کرتی ہے:

"میری شفقت موجزن ہے، میں اپنے قہر کی شدت کے مطابق عمل نہیں کروں گا۔ میں ہرگز افرائیم کو ہلاک نہ کروں گا، کیونکہ میں انسان نہیں، خدا ہوں۔"[1]

مزید لکھا ہے: "خدا انسان نہیں کہ جھوٹ بولے اور نہ وہ آدم زاد ہے کہ اپنا ارادہ بدلے۔"[2]

یعنی خدا کی دو حیثیتیں ہو ہی نہیں سکتیں۔

③ مسیحی حضرات نے ان دو حیثیتوں کو تجسیم کی اصطلاح پہنائی ہوئی ہے جس کے حوالے سے عیسائی سکالر کہتے ہیں: "ذاتِ الٰہی کے دوسرے اقنوم (بیٹے) نے جسم اختیار کیا۔"... آگے جاکر رقم طراز ہیں:

"اگر اس عقیدے کو عہدِ عتیق کے توحید پرستی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو کفر نظر آتا ہے اور کٹر یہودی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔"[3]

جناب عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ اور خود کو ایک کہا تو یہودی پتھر اٹھا کر انہیں سنگسار کرنے لگے، تو عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں، ان میں سے کس کام کے سبب سے مجھے سنگسار کرتے ہو؟ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب سے تجھے سنگسار کرتے ہیں اور اس لیے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ

"میں نے کہا تم خدا ہو؟ جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا۔"[4]

یہ دو حیثیتیں واضح کرنے کا موقع تھا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وضاحت کر دی کہ اگر میں اپنے آپ کو اور خدا کو ایک کہتا ہوں تو یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے پہلے انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے خدا کہا۔ اگر سیدنا مسیح کی دو حیثیتیں ہیں تو پھر پہلے انبیا بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ کوئی مسیحی اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

معلوم ہوا کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے جو بعض ایسے مبہم کلمات آئے ہیں، ان سے ہرگز ان کی اُلوہی حیثیت مترشح نہیں ہوتی، یہ مسیحی حضرات کا تحکم اور سینہ زوری ہے۔

④ اگر جناب مسیح علیہ السلام کی دو حیثیتیں تھیں تو سولی پر جس نے جان دی تھی وہ کون تھا جسے مارا گیا، منہ پر تھوکا گیا، کانٹوں کا تاج پہنایا گیا وغیرہ کون تھا؟ اگر انسان (ناسوت) تھا تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ابن اللہ نے ہمارے گناہوں کے کفارے میں جان دی، پھر اس نظریے کو ترک کر دینا چاہیے۔

---

۱ ہوسیع ۱۱:۹ ۲ گنتی ۲۳:۱۹

۳ قاموس الکتاب از ایف ایس خیر اللہ (مسیحی سکالر): ۲۳۴-۲۳۵، ناشر مسیحی اشاعت خانہ فیروز پور روڈ لاہور، طبع نہم، ۲۰۰۸ء

۴ انجیل یوحنا ۱۰:۳۰-۳۵

دریں صورت ماننا پڑے گا کہ جناب مسیح علیہ السلام پر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ محض انسان تھے، ان کی اُلوہی حیثیت ختم تھی۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ ابن اللہ (لاہوت) تھا، خدائی حیثیت تھی تو کیا خدا اتنا کمزور ہو سکتا ہے؟ اور کیا خدا کو موت آسکتی ہے؟ آیا خدا کے منہ پر کوئی تھوک سکتا ہے؟ خدا اتنا عاجز و درماندہ ہو سکتا ہے؟

⑤ ان تمام بائبلی حوالہ جات سے پیچھا چھڑانے کے لیے مسیحیوں کا سیدنا مسیح علیہ السلام کی دو حیثیتوں کو ماننا، ہر مذکورہ بات میں جاری نہیں ہوتا کیونکہ کئی ایسی باتیں ہیں جن کا تعلق (ناسوت) جسم سے ہے ہی نہیں۔

مثلاً انھوں نے اپنے دوبارہ آنے کے وقت سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

انجیر کے درخت کو دور سے دیکھ کر پہچان نہ سکے کہ پھل ہے کہ نہیں؟

⑥ "اور یسوع حکمت اور قد و قامت میں اور خدا اور انسان کی مقبولیت میں ترقی کرتا گیا۔"[1]

جسم کبھی علم اور بے علمی سے متصف ہوتا ہے؟ نیز کیا جسم بھی کبھی حکیم و دانا ہوا ہے؟

اسی طرح جناب مسیح علیہ السلام کا خوف زدہ ہونا، غم زدہ ہونا، مضطرب ہونا کیا ان کا تعلق جسم سے ہے؟

⑦ جناب مسیح علیہ السلام کا دو حیثیتیں تسلیم کرنا یعنی لاہوتی (الوہی) اور ناسوتی (بشری) تقاضا کرتا ہے کہ یہ ایک ہی وقت میں خالق بھی ہوں اور مخلوق بھی ہوں، رازق بھی ہوں اور مرزوق بھی ہوں، غنی بھی ہوں اور محتاج بھی ہوں، کامل بھی ہوں اور ناقص بھی ہوں، ہر چیز کو جاننے والا بھی ہوں اور جاہل بھی ہوں، قدیم بھی ہوں اور حادث بھی ہوں۔

کیا یہ محال نہیں؟ اور کیا کوئی عقل مند ایسی ناممکن چیز کو تسلیم کرلے گا...؟

بالفرض اگر کوئی کہہ دے کہ یہ دونوں حیثیتیں اکٹھی طاری نہیں ہوتی تھیں تو اس کا جواب یوں ہے:

جناب مسیح علیہ السلام پر جب ناسوتی (انسانی) کیفیت ہوتی تھی وہ اس وقت خدائی صفات سے خالی ہوتے تھے، یعنی کوئی وقت ایسا بھی ان پر آتا تھا جب وہ خدائی صفات سے عاری ہوتے تھے۔

کیا خدا ایسا ہوتا اور ہو سکتا ہے...؟

یہ اعتراضات ملاحظہ کرنے کے بعد عیسائیوں کی طرف سے یہ جواب آتا ہے کہ ناممکنات اشیا کا اجتماع مخلوق میں محال ہے، خدا میں نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ

⑧ اس طرح تو پھر ہر مذہب والا سچا ہے خواہ اس کا تعلق ہندومت سے ہو یا یونانی بت پرستی سے کیونکہ انھوں نے اپنے دیوتاؤں کے حوالے سے جو دیومالائی داستانیں گھڑی ہوئی ہیں وہ بھی درست قرار پاتی ہیں، نیز مسیحیوں کی طرح تثلیث ہی کیا پھر تو ہزاروں خداؤں کا تصور بھی صحیح ہوا۔

---

1 انجیل لوقا ۲:۵۲

کوئی مسیحی اس کو اپنے ہی اصولوں کے مطابق تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے؟ ہر گز ایسا کوئی نہیں ملے گا جس سے معلوم ہوا کہ ان کی طرف سے آنے والا درج بالا جواب حقیقت کے خلاف ہے۔

⑨ اللہ تعالیٰ کی قدرت گو کہ غیر محدود اور مطلق ہے لیکن اس کا تعلق عقلی لحاظ سے ممکن اشیا سے ہے، نہ کہ غیر ممکن سے مثلاً: انہی مسیحی لوگوں سے ہم پوچھتے ہیں کہ آیا اللہ تعالیٰ اپنے جیسا کوئی دوسرا خدا پیدا کر سکتا ہے؟ اگر وہ کہیں جی ہاں تو ہم پوچھیں گے یہ تو مخلوق ہو گا، وہ اللہ کے برابر اور اس جیسا کیسے ہو گیا؟ اگر وہ مخلوق ہے تو الٰہ نہیں اگر الٰہ ہے تو مخلوق نہیں۔

کیا یہاں بھی درج بالا اصول لاگو ہو سکتا ہے؟

⑩ ایک اور انداز سے: کیا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی کو اپنی خدائی اور اختیارات سے باہر کر سکتا ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اختیارات اور طاقت ایک خاص حد اور علاقے تک ہے۔ اور اگر جواب نفی میں ہے اور یہی صحیح ہے تو معلوم ہوا کہ قدرت الٰہی کا تعلق عقلی لحاظ سے محال اور ناممکن چیزوں سے نہیں۔

⑪ ملحدین اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا پتھر بنا سکتا ہے جس کو وہ خود بھی نہ اٹھا سکے؟ مسیحی کیا جواب دیں گے؟... اگر جواب ہاں میں دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی کمزوری ثابت ہوتی ہے اور اگر نفی میں جواب ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نقص لازم آتا ہے۔

لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وطاقت لاانتہا ہے۔ یہ چیز اس میں نقص ثابت کرتی ہے، اس لیے اس کی شان کے لائق ہی نہیں لہٰذا وہ کسی چیز سے عاجز نہیں آ سکتا، اور اس کا عاجز نہ آنا اس کی کمالِ قدرت وطاقت پر دلالت کرتا ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نہ تو بھولتا ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس سے چھپ سکتی ہے۔

مسیحی لوگوں کے بقول یہ محال اشیا اللہ تعالیٰ میں پائی جانی چاہئیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلك

خلاصہ

انا جیل نے جناب مسیح علیہ السلام میں بشری کمزوری واضح کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہر گز نہیں، لہٰذا ان کمزوریوں کے باوصف حضرت مسیح علیہ السلام خدا نہیں ہو سکتے۔

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ لکھا ہے: "کیوں کہ میں خداوند لا تبدیل ہوں۔"[1]

---

1 ملاکی ۳:۶

یعقوب کے خط میں ہے: ''اے میرے پیارے بھائیو! فریب نہ کھانا، ہر اچھی بخشش اور ہر کامل انعام اوپر سے ہے اور نوروں کے باپ کی طرف سے ملتا ہے جس میں نہ کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ گردش کے سبب سے اس پر سایہ پڑتا ہے۔''[1]

ایک افسردہ دل خدا تعالیٰ کو مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''تو ان کو لباس کی مانند بدلے گا اور وہ بدل جائیں گے، پر تو لاتبدیل ہے۔''[2]

(عیسائیوں کے قولی شبہات کا اِزالہ)

شبہ اوّل: بائبل میں 'مسیح کو ابن اللہ' کہا گیا ہے!

''جناب مسیح علیہ السلام کو اناجیل اربعہ اور دیگر خطوط و رسائل میں کئی مرتبہ 'ابن اللہ' کہہ کر پکارا گیا ہے جس سے ان کی اُلوہیت ثابت ہوتی ہے کیونکہ بیٹا اپنے باپ کے جوہر سے ہی ہوتا ہے۔''

جواب: جو لوگ بائبل کا مطالعہ نہیں رکھتے، ان کی نظر میں یہ بہت وزنی دلیل ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ ابن اللہ کا لفظ فقط جناب عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ہی نہیں آیا بلکہ بائبل اس سے بھری پڑی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبلی اصطلاح کے مطابق خدا کا بیٹا اللہ تعالیٰ کے محبوب، مقرب، اور پسندیدہ شخص پر بولا جاتا ہے، نہ کہ اس کا حقیقی معنیٰ مراد لیا جائے گا۔ ورنہ سب وہ لوگ جن کے حق میں بائبل کے اندر یہ لقب استعمال ہوا وہ بھی خدا تعالیٰ کے حقیقی فرزند کہلانے کے حقدار ٹھہرتے ہیں، ان کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

دوم: جناب مسیح علیہ السلام کے لیے آنے والا لفظ 'ابن اللہ' اگر اپنے حقیقی معنی میں ہے تو پھر بائبل میں ہی ان کے لیے آنے والے الفاظ ابن آدم[3] اور ابن داود[4] کے متصادم ہے کیونکہ یہاں بھی حقیقی معنی ہی مراد ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کسی کے دو حقیقی والد ہوں، لامحالہ ایک کو مجازی معنی میں ماننا پڑے گا۔ سو مجازی معنیٰ اسی کا لیا جائے گا جس کی بائبل تصدیق کرتی ہے اور وہ 'ابن اللہ' ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام ناسوت کے لحاظ سے ابن انسان اور لاہوت کے اعتبار سے ابن اللہ تھے تو یہ بھی ناقابل قبول اور کمزور بات ہے کیونکہ جیسا کہ پیچھے گزرا کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں خالق و مخلوق، رازق و مرزوق، الٰہ اور بندہ نہیں ہو سکتے۔

---

۱ یعقوب کا خط ۱:۱۶-۱۷

۲ زبور ۱۰۲:۲۷

۳ انجیل متی ۸:۲۰ وغیرہ ۴ انجیل متی ۱:۱

سوم: کسی بھی کتاب کے مغلق لفظ کی بہترین اور معتبر تشریح وہی ہوتی ہے جو اسی کتاب میں کر دی گئی ہو، چنانچہ لفظ 'ابن اللہ' کی تشریح عہد جدید میں یوں کی گئی اور وہ بھی جناب عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق:

"انجیل مرقس کا مصنف جناب مسیح علیہ السلام کے آخری لمحات کی تصویر کشی یوں کرتا ہے: اور جو صوبہ دار اسکے سامنے کھڑا تھا اس نے اسے یوں دم دیتے ہوئے دیکھ کر کہا بے شک یہ آدمی خدا کا بیٹا تھا۔"[1]

جبکہ یہی واقعہ انجیل لوقا کے مصنف نے یوں نقل کیا ہے:

"اے باپ! میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں اور یہ کہہ کر جناب مسیح علیہ السلام نے دم دے دیا، یہ ماجرا دیکھ کر صوبہ دار نے خدا کی تمہید کی اور کہا: بے شک یہ آدمی راست باز تھا۔"[2]

معلوم ہوا خدا کا بیٹا نیک صالح اور برگزیدہ شخص پر بولا جاتا ہے نا کہ خدا کے حقیقی بیٹے پر۔

'خدا کا بیٹا'

یہ اصطلاح یہودیوں میں پہلے سے رائج تھی لیکن جو مفہوم عیسائی حضرات نے بعد میں گھڑا، اہل یہود کے ہاں وہ سراسر کفر اور قابل گردن زدنی ہے، چنانچہ جب یہ کسی کو خدا کا بیٹا کہیں گے تو لامحالہ وہی مطلب ہوگا جو توحید کے منافی نہ ہو اور بائبل عہد قدیم کے مطابق ہو اور وہ ہے: محبوب، پیارا، نیک، صالح اور راست باز۔

① سو ایک یہودی عالم نتن ایل کو جناب عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد فلپس نے کہا:

"جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے، وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے، نتن ایل نے اس سے کہا: کیا ناصرۃ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟ فلپس نے کہا: چل کر دیکھ لے۔ یسوع نے نتن ایل کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کے حق میں کہا: دیکھو یہ فی الحقیقت اسرائیلی ہے، اس میں مکر نہیں۔ نتن ایل نے اس سے کہا: تو مجھے کہاں سے جانتا ہے؟ یسوع نے اس کے جواب میں کہا: اس سے پہلے کہ فلپس نے تجھے بلایا، جب تو انجیر کے درخت کے نیچے تھا تو میں نے تجھے دیکھا۔ نتن ایل نے اس کو جواب دیا: اے ربی! تو خدا کا بیٹا ہے۔"[3]

یہ واقعہ اس دن کا ہے جبکہ ابھی تبلیغ شروع کیے جناب عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرا دن تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک یہودی عالم 'خدا کے بیٹے' کی اصطلاح ایسے مفہوم میں بولے جو ابھی ایجاد ہی نہیں ہوا اور نہ ہی معروف ہوا۔ لامحالہ وہ اس کا وہی مطلب لے رہا ہے جو اس کی شریعت میں تھا اور وہ نیک، صالح اور راستباز کا مفہوم ہے۔

---

۱ انجیل مرقس ۱۵:۳۹

۲ انجیل لوقا ۲۳:۴۶-۴۷

۳ انجیل یوحنا ۱:۴۵-۴۹

② یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بائبل میں برے انسان کو 'شیطان کا بیٹا' کہا گیا ہے۔[1]

③ جناب مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا: "مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کا بیٹا کہلائیں گے۔"[2]

اسی انجیل کے اسی باب میں آگے جا کر یہ قول لکھا ہوا ہے:

"لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور ستانے والوں کے لیے دعا کرو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے، بیٹے ٹھہرو۔"[3]

④ انجیل لوقا میں لکھا ہے: "تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو اور بغیر ناامید ہوئے قرض دو تو تمہارا اجر بڑا ہوگا اور تم خدا تعالیٰ کے بیٹے ٹھہروگے۔"[4]

جناب عیسیٰ علیہ السلام نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"ان میں بیاہ شادی نہ ہوگی کیونکہ وہ پھر مرنے کے بھی نہیں۔ اس لیے کہ فرشتوں کے برابر ہوں گے اور قیامت کے فرزند ہو کر خدا کے بھی فرزند ہوں گے۔"[5]

⑤ انجیل یوحنا میں یوں آیا ہے: "لیکن جتنوں نے اسے (یعنی مسیح کو) قبول کیا، اس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا یعنی انھیں جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ نہ خون سے، نہ جسم کی خواہش سے، نہ انسان کے ارادہ سے بلکہ خدا سے پیدا ہوئے۔"[6]

اناجیل کے ان حوالہ جات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے مصنفین کے ہاں 'ابن اللہ' اور 'خدا کا بیٹا' نیک صالح اور اللہ تعالیٰ کے محبوب مقرب شخص پر بولا جاتا ہے۔

'خدا کا بیٹا' مجازی مفہوم میں

⑥ عہد جدید کے بعض خطوط میں 'ابن اللہ' کا مجازی معنیٰ اس قدر واضح موجود ہے کہ کسی شک و تردّد کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ یوحنا کے پہلے خط میں لکھا ہے:

"جس کا یہ ایمان ہے کہ یسوع ہی مسیح ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور جو کوئی والد سے محبت رکھتا ہے وہ اس کی اولاد سے بھی محبت رکھتا ہے، جب ہم خدا سے محبت رکھتے اور اس کے حکموں پر عمل کرتے

---

۱ رسولوں کے اعمال ۱۳:۱۰
۲ انجیل متی ۵:۹
۳ انجیل متی ۵:۴۴-۴۵
۴ انجیل متی ۶:۳۵
۵ انجیل لوقا ۲۰:۳۶،۳۵
۶ انجیل یوحنا ۱:۱۳:۱۲

ہیں تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے فرزندوں سے بھی محبت رکھتے ہیں۔"[1]

اس خط کے اسی باب کے آخر میں ہے:

"ہم جانتے ہیں کہ جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے، وہ گناہ نہیں کرتا بلکہ اس کی حفاظت وہ کرتا ہے جو خدا سے پیدا ہوا اور وہ شریر اسے چھونے نہیں پاتا۔"[2]

اسی خط کے تیسرے باب میں مزید وضاحت ہے:

"جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے، وہ گناہ نہیں کرتا کیونکہ اس کا تخم اس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ خدا سے پیدا ہوا ہے، اسی سے خدا کے فرزند اور ابلیس کے فرزند ظاہر ہوتے ہیں۔"[3]

باب چہارم میں یوں لکھا ہے:

"اے عزیزو! آؤ ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں کیونکہ محبت خدا کی طرف سے ہے اور جو کوئی محبت رکھتا ہے، وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور خدا کو جانتا ہے۔"[4]

⑦ پولوس نے ایک خط میں لکھا ہے:

"اس لیے کہ جتنے خدا کے روح کی ہدایت سے چلتے ہیں، وہی خدا کے بیٹے ہیں، کیونکہ تم کو غلامی کی روح نہیں ملی جس سے پھر ڈر پیدا ہو بلکہ لے پالک ہونے کی روح ملی جس سے ہم ابا یعنی اے باپ! کہہ کر پکارتے ہیں۔ روح خود ہماری روح کے ساتھ مل کر گواہی دیتا ہے کہ ہم خدا کے فرزند ہیں۔"[5]

⑧ اپنے دوسرے خط میں پولوس یوں گویا ہوا:

"سب کام شکایت اور تکرار کے بغیر کیا کرو تاکہ تم بے عیب اور بھولے ہو کر ٹیڑھے اور کج رو لوگوں میں خدا کے بے نقص فرزند بنے رہو۔"[6]

ان تمام حوالہ جات میں خدا کا بیٹا خدا کے بیٹے اور خدا سے پیدا ہوئے جیسے الفاظ اپنے حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازی طور پر مستعمل ہیں۔

---

۱ یوحنا کا پہلا خط ۵:۱-۲

۲ یوحنا کا پہلا خط ۵:۱۸

۳ یوحنا کا پہلا خط ۳:۹-۱۰

۴ یوحنا کا پہلا خط ۴:۷

۵ رومیوں کے نام خط ۸:۱۴-۱۶

۶ فلپیوں کے نام خط ۲:۱۴-۱۵

انبیاے بنی اسرائیل کے لئے 'خدا کا بیٹا'

⑨ عہد قدیم اور عہد جدید میں کئی مقامات پر بنی اسرائیلی انبیاے کرام کے لیے بھی 'خدا کا بیٹا' اور کئی کے لیے 'خدا کا پہلوٹھا بیٹا' کی اصطلاح بولی گئی ہے:

"انجیل لوقا میں جناب مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ لکھا ہوا ہے جسے آدم علیہ السلام تک پہنچایا گیا اور ان کا تذکرہ پھر یوں ہے: آدم ابن خدا۔"[1]

یہ بات واضح ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حقیقی بیٹے نہ تھے۔ کوئی مسیحی بھی ان کو حقیقی بیٹا ماننے کے لیے تیار نہیں، لہٰذا سیدنا مسیح علیہ السلام کے لیے آنے والا یہی لفظ ان کے حقیقی بیٹے ہونے پر کیسے دلالت کر سکتا ہے۔ مزید یہ کہ جناب آدم علیہ السلام بغیر ماں اور بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تو تھیں، لہٰذا اگر حقیقی بیٹا ماننا ہی ہے تو آدم علیہ السلام اس کے زیادہ حق دار تھے، جبکہ نہ مسلمان ایسا مانتے ہیں اور نہ ہی مسیحی۔

⑩ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جب فرعون کے پاس بات چیت کے لیے بھیجا تو فرمایا:

"تب تو فرعون سے یوں کہنا کہ خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا پہلوٹھا بیٹا ہے، اس لیے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے تاکہ وہ میری بندگی کرے اور اگر اسے نہیں جانے دیتا تو دیکھ میں تیرے پہلوٹھے بیٹے کو مار ڈالوں گا۔"[2]

⑪ حضرت داود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور جب تیرے دن تمام ہو جائیں اور تو اپنے باپ دادا کے ساتھ سو جائے اور جب میں تیرے بعد تیری نسل کو جو تیری صلب سے ہو گی برپا کروں گا اور اسی سلطنت کو مستقل کروں گا تو وہ میرے نام کے لیے ایک گھر بنائے گا اور میں اس کی سلطنت کے تخت کو ابد تک برقرار رکھوں گا۔ میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہو گا۔"[3]

⑫ داود علیہ السلام کے حوالے سے خدا تعالیٰ نے کہا:

"وہ مجھے پکارے گا کہ تو میرا باپ ہے، میرا خدا اور میری نجات کی چٹان ہے اور میں اسے پہلوٹھا بناؤں گا، میں بادشاہوں میں سب سے اعلیٰ۔"[4]

---

۱ انجیل لوقا ۳:۳۸

۲ خروج ۴:۲۲-۲۳

۳ ۲-سموئیل ۷:۱۲-۱۳ ۴ زبور ۸۹:۲۷-۲۸

⑬ یرمیاہ نبی کی کتاب میں خدا تعالیٰ کا قول یوں لکھا ہے:

"میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم (اسرائیل کا ہی دوسرا نام) میرا پہلوٹھا ہے۔"[1]

اگر خدا کا بیٹا کہنے سے حقیقی بیٹا مراد ہے تو سیدنا داود علیہ السلام اور سیدنا یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام زیادہ حق دار ہیں کیونکہ سابقہ شریعتوں اور معاشرتی رواج کے مطابق پہلوٹھا (بڑا بیٹا) بعد والوں سے باپ کے زیادہ قریب اور احترام کے زیادہ لائق ہوتا ہے بلکہ بعض علاقوں میں تو اس کو باپ کی جگہ پر ہی سمجھا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل 'خدا کے فرزند'

⑭ عہد قدیم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کئی مقامات پر سیدنا یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد کو بھی خدا کے فرزند کہا گیا ہے، چنانچہ لکھا ہے: "تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔"[2]

⑮ اسی کتاب میں بنی اسرائیل سے خدا کی ناراضگی کے حوالے سے لکھا ہے:

"اور خدا نے دیکھا اور متنفر ہوا اور بیٹوں اور بیٹیوں سے غصہ ہوا۔"[3]

⑯ زبور میں آیا ہے: "میں نے کہا تم خدا ہو تم سب حق کے فرزند ہو تو بھی تم آدمیوں کی طرح مرو گے اور سرداروں میں سے ایک کی طرح گر جاؤ گے۔"[4]

⑰ بنی اسرائیل کے حوالے سے خدا نے کہا: "میں نے فرزندوں کی تربیت کی اور انھیں سرفراز کیا مگر انھوں نے میرے خلاف سرکشی کی۔"[5]

⑱ مزید لکھا ہے: "اور بنی اسرائیل کا شمار ساحل کی ریت کی طرح ہوگا جو ناپی نہیں جاتی اور گنی نہیں جاتی اور اس کی بجائے کہ ان سے کہا جائے کہ تم میری امت نہیں۔ وہ زندہ خدا کے فرزند کہلائیں گے۔"[6]

⑲ اس کتاب میں آگے جا کر خدا تعالیٰ کا یہ قول لکھا ہے: "جب بنی اسرائیل ہنوز بچہ ہی تھا تو میں نے اس سے محبت رکھی اور میں نے مصر سے اپنے بیٹے کو بلایا۔"[7]

فرشتے 'خدا کے فرزند'

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ فرشتوں کو بھی خدا تعالیٰ کے بیٹے اور فرزند کہا گیا ہے، چنانچہ لکھا ہے: "اور ایک دن

---

۱ یرمیاہ ۳۱:۹
۲ استثنا ۱۴:۱
۳ استثنا ۳۲:۱۹
۴ زبور ۸۲:۶-۷
۵ یسعیاہ ۱:۲
۶ ہوسیع ۱:۱۰ ۷ ہوسیع ۱۱:۱

خدا کے بیٹے خداوند کے حضور حاضر ہونے کے لیے آئے اور شیطان بھی ان کے درمیان آیا۔"[1]

یہی بات اسی کتاب کے دوسرے باب، فقرہ ایک میں بھی لکھی ہوئی ہے۔

کوئی بھی مسیحی ان مقامات پر حقیقی معنی لینے کے لیے تیار نہیں ہو گا، لہٰذا جناب مسیح علیہ السلام کے متعلق آنے والے اسی لفظ کو بھی انہی دلائل کی روشنی میں مجازی معنی میں لیا جائے گا۔

'خدا کے فرزند' کی اصطلاح عہد قدیم میں آئی ہے جس کے اوّلین مخاطب یہودی ہیں اور ان کی ہی زبان میں ہے، لہٰذا جب یہ لوگ اس کو مجازی مفہوم میں لیتے ہیں تو بعد میں نئے آنے والے غیر زبانوں کے افراد اس کا مفہوم کیسے بدل سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ لفظ فرزند اور بیٹے کی اصطلاح ہر لغت میں پائی جاتی ہے اور وہاں اس کو مجازی معنی میں ہی لیا جاتا ہے، مثلاً ہمارے ہاں ابن الوقت کا لفظ ہے، عربی میں مسافر کو ابن السبیل کہا جاتا ہے، اس طرح کسی بھی تعلیمی ادارے سے تعلیم مکمل کرنے والوں کو أبناء جامعہ کہا جاتا ہے۔ وغیرہ

بائبل میں بھی اس طرح ہے:

"چنانچہ جناب مسیح علیہ السلام نے جہنم میں جانے والوں کو جہنم کے فرزند کہا۔"[2]

اوریر و شلیم شہر کے رہنے والوں کو 'اس کے بچے' قرار دیا۔[3]

دنیادار لوگوں کو اس 'عالَم کے فرزند' کہا ہے۔[4]

جبکہ نیک اور راست باز لوگوں کو 'قیامت کے فرزند' کہا ہے۔[5]

یہ تو جناب عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال تھے جبکہ پولوس نے تھسل نیکیوں کو 'نور' اور 'دن کے فرزند' کہا ہے۔[6]

کیا اب بھی کوئی گنجائش باقی ہے؟

اعتراض: اس تفصیل کے باوجود مسیحی حضرات جناب مسیح علیہ السلام کو خدا کا حقیقی بیٹا قرار دینے کی ضد کرتے ہیں اور ان دلائل کے مقابل کہتے ہیں کہ دراصل ان کو خدا نے 'اکلوتا فرزند' کہا ہے جبکہ باقی مقامات پر ایسا نہیں۔[7]

جواب: از روئے بائبل لفظ 'اکلوتا' کوئی ایسی حیثیت نہیں رکھتا کہ جس میں حقیقی معنی کے علاوہ کوئی دوسرا

---

۱ ایوب ۱:۶

۲ انجیل متی ۲۳:۵

۳ انجیل متی ۲۳:۳۷

۴ انجیل لوقا ۲۰:۳۴

۵ انجیل لوقا ۲۰:۳۶

۶ تھسل نیکیوں کے نام پہلا خط ۵:۵

۷ انجیل لوقا ۹:۳۸

مفہوم پایا ہی نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس میں رفعت، بلندی اور خصوصیت کا معنی بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ تورات میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے اسحاق کو ان کا 'اکلوتا فرزند' کہا گیا ہے۔[1] حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کا بڑا بیٹا اسماعیل علیہ السلام زندہ اور موجود تھا۔

کیا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ صرف اور صرف جناب اسحاق علیہ السلام ہی ان کے حقیقی بیٹے تھے؟ واضح رہے کہ بائبل میں سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو بھی جناب ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا کہا گیا ہے۔[2]

دوسرا شبہ: مسیح کا 'اللہ تعالیٰ کو باپ قرار' دینا

جناب مسیح علیہ السلام نے کئی مواقع[3] پر تاکیدی طور پر اللہ تعالیٰ کو اپنا باپ قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے پیدا ہوئے ہیں اور اس صورت میں وہ بھی اپنے باپ کی طرح خدا ہوئے۔

جواب

① اوّل: اناجیل سے واضح ہوتا ہے کہ جناب مسیح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو جہاں 'اپنا باپ' کہا ہے وہاں کئی مرتبہ ایمان والوں کا بھی باپ قرار دیا ہے، مثلاً متی کے چھٹے باب میں بارہ مرتبہ یہ بات آئی ہے بلکہ فقرہ نمبر ۹ میں مسیحیوں کی نماز ہے جس کی ابتدا یوں ہے: "اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے۔"

مزید حوالہ جات یہ ہیں: متی ۱۰:۲۹ لوقا ۶:۳۶ لوقا ۱۲:۳۱-۳۲ یوحنا ۲۰:۱۷

اگر اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ ہے، اس وجہ سے وہ خدا بنتے ہیں تو پھر سب ایمان والے بھی خدا ہوئے اور یہ بات اتفاقی طور پر باطل ہے لہٰذا لامحالہ انجیل کی اصطلاح کے مطابق ہی باپ کا معنی لیا جائے گا یعنی "پیار و محبت اور شفقت کرنے والا لوگوں سے خیر و بھلائی کا ارادہ کرنے والا ان کی راہنمائی کرنے والا۔"

② دوم: لفظ 'باپ' کا معنی راہبر و راہنما اناجیل سے ہی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ایک موقع پر یہودیوں اور مسیح علیہ السلام کا مکالمہ ہوا تو یہودیوں نے اپنا باپ خدا کو کہا لیکن جناب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے ... تم اپنے باپ ابلیس سے ہو اور اپنے باپ کی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہو۔"[4]

یہود جو کہ عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کر قتل کرنا چاہتے تھے اور ان کے منکر تھے وہ چونکہ شیطان کے بہکاوے میں

---

۱ پیدائش ۲۲:۱-۱۲

۲ پیدائش ۱۶:۱۵

۳ انجیل یوحنا میں تو کثیر تعداد میں اللہ تعالیٰ کو 'باپ' کہہ کر پکارا گیا ہے اور انجیل متی ۷:۲۱، متی ۱۱:۲۷، متی ۲۴:۳۶، لوقا ۲۳:۳۴، لوقا ۲۳:۴۶

۴ انجیل یوحنا ۸:۴۲-۴۴

آئے تھے، اس لیے جناب عیسیٰ علیہ السلام نے 'شیطان کو ان کا باپ' کہا۔

مزید وضاحت پولوس نے کرنتھیوں کی طرف پہلا خط لکھتے ہوئے کی:

"میں تمھیں شرمندہ کرنے کے لیے یہ باتیں نہیں لکھتا، بلکہ اپنے پیارے فرزند جان کر تم کو نصیحت کرتا ہوں کیونکہ اگر مسیح میں تمہارے اُستاد دس ہزار بھی ہوتے تو بھی تمہارے باپ بہت سے نہیں، اس لیے کہ میں ہی انجیل کے وسیلہ سے مسیح یسوع میں تمہارا باپ بنا۔"[1]

پولوس اپنے آپ کو راہبر و مقتدیٰ قرار دے رہا ہے، نہ کہ حقیقی ولدیت بتائی جا رہی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہمارے معاشرے میں 'استاد کو باپ' کہہ دیا جاتا ہے۔

③ سوم: بائبل میں فقط عیسیٰ علیہ السلام نے ہی اللہ تعالیٰ کو 'اپنا باپ' یا 'میرا باپ' کہہ کر نہیں پکارا بلکہ کئی انبیا سے ایسا ملتا ہے، لہٰذا اگر کسی کے ذہن میں لفظ 'اپنا' یا 'میرا' سے شک پیدا ہوتا ہے تو یاد رکھ لے کہ یہ نہایت کمزور اور تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ ناپائیدار دلیل ہے۔ حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کے حوالے سے فرمایا کہ:

"وہ مجھے پکار کر کہے گا: تو میرا باپ میرا خدا اور میری نجات کی چٹان ہے۔"

آگے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور میں اس کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا۔"[2]

یسعیاہ نبی نے خدا تعالیٰ کو یوں مخاطب کیا: "یقیناً تو ہمارا باپ ہے اگرچہ ابرہام ہم سے ناواقف ہو اور اسرائیل ہم کو نہ پہچانے۔ تو اے خداوند! ہمارا باپ اور فدیہ دینے والا ہے۔"[3]

اسی کتاب کے اگلے باب میں اس طرح ہے:

"اے خداوند! تو ہمارا باپ ہے۔ ہم مٹی ہیں اور تو ہمارا کمہار ہے۔"[4]

④ یہ تو انبیا کی بات ہے۔ عام انسانوں نے بھی اللہ تعالیٰ کو اپنا باپ کہا ہے: مثلاً یہودیوں نے ایک موقع پر جناب عیسیٰ علیہ السلام کو ان الفاظ میں جواب دیا تھا: "ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔"[5]

⑤ اسی طرح مسیحیوں کی نماز کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے۔"[6]

---

۱ ۱-کرنتھیوں ۴:۱۴-۱۵

۲ زبور ۸۹:۲۶-۲۷

۳ یسعیاہ ۶۳:۱۶

۴ یسعیاہ ۶۴:۸

۵ انجیل یوحنا ۸:۱۴

۶ انجیل متی ۶:۹

پولوس نے کئی مرتبہ خدا تعالیٰ کو ہمارے باپ خدا کہہ کر یاد کیا ہے۔[1]
لامحالہ ان انبیا اور دیگر لوگوں کا مقصد مجازی تھا نا کہ حقیقی۔

جناب عیسیٰ علیہ السلام جو کہ یہودیوں کو مخاطب کرتے تھے ان کی کتاب کو جانتے اور ان کے محاورے کو پہچانتے تھے، انھوں نے بھی مجازی لحاظ سے اس نسبت کو بولا، ورنہ ضرور کسی موقع پر اس کی وضاحت کر دیتے، کیونکہ انبیا کے آنے کا مقصد ہی لوگوں کے عقائد و نظریات کو درست کرنا ہوتا ہے، مزید شکوک و شبہات میں ڈالنا نہیں، اور اگر پورے تبلیغی دور (جو تین سال پر محیط تھا) میں یہودیوں کو ذرا سا بھی شک ہوا تو انھوں نے فوراً جناب عیسیٰ علیہ السلام کو پتھروں سے سنگ سار کرنا چاہا لیکن حضرت عیسیٰ نے وضاحت کر کے معاملہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، جس کی تفصیل اگلے شبہ کے تحت آ رہی ہے۔

تیسرا شبہ: مسیح کا قول: ''میں اور باپ ایک ہیں۔''

مسیحیوں کی طرف سے جناب مسیح علیہ السلام کے اس قول کو خوب اچھالا جاتا ہے اور انہیں الٰہ کے مرتبہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا: ''میں اور باپ ایک ہیں۔''[2]

جواب: اس جملے کو اگر اسی حد تک پڑھیں تو واقعی عام آدمی پریشان ہو سکتا ہے لیکن اگر اصول کے مطابق اس کو سیاق و سباق کے ساتھ پڑھیں تو پھر حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ مکمل عبارت یوں ہے:

''یروشلیم میں عید تجدید ہوئی اور جاڑے کا موسم تھا۔ اور یسوع ہیکل کے اندر سلیمانی برآمدہ میں ٹہل رہا تھا۔ پس یہودیوں نے اس کے گرد جمع ہو کر اس سے کہا: تو کب تک ہمارے دل کو ڈانواں ڈول رکھے گا؟ اگر تو مسیح ہے تو ہم سے صاف کہہ دے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ میں نے تو تم سے کہہ دیا مگر تم یقین نہیں کرتے۔ جو کام میں اپنے باپ کے نام سے کرتا ہوں، وہی میرے گواہ ہیں۔ لیکن تم اس لیے یقین نہیں کرتے کہ میری بھیڑوں میں سے نہیں ہو۔ میری بھیڑیں میری آواز سنتی ہیں اور میں اُنہیں جانتا ہوں اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ اور میں اُنہیں ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہوں اور وہ ابد تک کبھی ہلاک نہ ہوں گی اور کوئی اُنہیں میرے ہاتھ سے چھین نہ لے گا۔ میرا باپ جس نے مجھے وہ دی ہیں، سب سے بڑا ہے اور کوئی اُنہیں باپ کے ہاتھ سے نہیں چھین سکتا۔ میں اور باپ ایک ہیں۔ یہودیوں نے اسے سنگ سار کرنے کے لیے پتھر اٹھائے۔ یسوع نے اُنہیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں۔ ان میں سے کس کام کے سبب سے مجھے سنگ سار کرتے ہو۔ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب سے تجھے

---

1 رومیوں 1:7، 1-کرنتھیوں 1:3، 2-کرنتھیوں 1:2، افسیوں 1:2، فلپیوں 1:2، فلیمون 1:3
2 انجیل یوحنا 10:30

سنگ سار کرتے ہیں اور اس لیے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو؟ جبکہ اس نے اُنہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا (اور کتاب مقدس کا باطل ہونا ممکن نہیں)۔ آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا، کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے، اس لیے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں؟ اگر میں اپنے باپ کے کام نہیں کرتا تو میرا یقین نہ کرو۔ لیکن اگر میں کرتا ہوں تو گو میرا یقین نہ کرو مگر ان کاموں کا تو یقین کرو تا کہ تم جانو اور سمجھو کہ باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں۔ اُنہوں نے پھر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔"[1]

① جناب مسیح علیہ السلام نے کس قدر واضح الفاظ میں تشریح کر دی کہ 'میرا اپنے آپ کو خدا کے ساتھ ایک' کہنے یا 'خدا کا بیٹا' کہنے کا مطلب اسی طرح کا ہے جس طرح کہ اسی شریعت میں انبیا کو خدا کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کو اس کے سبب نہ تو حقیقی خدا مانا گیا، نہ ہی اُنھوں نے لوگوں کو اس کی تبلیغ کی اور نہ ان پر کفر لازم آیا، لہٰذا میں بھی نہ تو کفر کہہ رہا ہوں اور نہ ہی قتل کی سزا کا مستحق ہوں۔

نوٹ: انبیاء علیہم السلام کو خدا کہہ کر پکارنے والی بات زبور میں ہے۔[2]

② جناب مسیح علیہ السلام نے 'میں اور باپ ایک ہیں' کی مزید تشریح کرتے ہوئے یہودیوں کو کہا کہ مجھ پر اس لیے تم کفر کا فتویٰ لگاتے ہو کہ میں نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا ہے یعنی انھوں نے ایک ہونے والے جملے کے باوجود اپنے آپ کو ہر لحاظ سے باپ (خدا) کے برابر قرار نہیں دیا بلکہ اپنا رتبہ ان سے نیچے ہی رکھا یعنی (بیٹا) کہا، ورنہ کسی ایک موقع پر ہی کبھی انھوں نے اپنے آپ کو باپ کہا؟ ہرگز نہیں۔ معلوم ہوا کہ زیر بحث جملے کا مفہوم و مطلب وہ نہیں جو کشید کیا جا رہا ہے۔

③ یہ بات بھی قابل غور ہے اگر جناب مسیح علیہ السلام واقعی حقیقی خدا یا خدا کے حقیقی بیٹے تھے تو اُنہیں واضح الفاظ میں اس کا اقرار کرنا چاہیے تھا، یہی موقع تھا کیونکہ یہودیوں نے ان کے جملے (میں اور باپ ایک ہیں) سے حقیقی دعویٰ ہی سمجھا تھا لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی تردید کی اور ان الفاظ کو مجازی معنی میں استعمال کر کے باقاعدہ زبور سے دلیل بھی دی۔ اگر مسیحیوں کا استدلال تسلیم کریں تو ثابت ہوتا ہے جناب مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کو دھوکے میں رکھا ہے ان کے سامنے دعویٰ کو واضح نہیں کیا اور ان کے ساتھ مغالطہ انگیزی سے کام لیا۔ نعوذ باللہ من ذلک!

④ یہ بھی معلوم ہوا کہ جناب مسیح علیہ السلام نے اپنے اوپر 'خدا کا بیٹا' اور 'خدا مجھ میں ہے۔' وغیرہ جملے اللہ تعالیٰ کا اُنہیں رسول مقرر کرنے کے سبب بولے تھے یعنی وہی بات کہ یہ الفاظ محبوب پیارے اور مقرب کے

---

1 انجیل یوحنا: ۱۰: ۲۲ تا ۳۹ 2 زبور ۸۲: ۶

مفہوم میں ہیں، نہ کہ حقیقی معنی میں۔

⑤ 'ایک ہونے والی بات' جناب مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں اور ان کے شاگردوں کے حوالے سے بھی کی ہے تو کیا ان سب کو ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے برابر قرار دیا جائے گا؟ اور کیا حواریوں کے شاگردوں کو کسی لحاظ سے ان کی برابری مل سکتی ہے؟ اسی انجیل یوحنا میں لکھا ہے:

"میں صرف ان (حواریوں) ہی کے لیے درخواست نہیں کرتا بلکہ ان کے لیے بھی جو ان کے کلام کے وسیلہ سے مجھ پر ایمان لائیں گے تاکہ وہ سب ایک ہوں یعنی جس طرح اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں، وہ بھی ہم میں ہوں اور دنیا ایمان لائے کہ تو ہی نے مجھے کو بھیجا ہے اور وہ جلال جو تو نے مجھے دیا ہے میں نے اُنہیں دیا ہے تاکہ وہ ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں۔ میں ان میں اور تو مجھ میں تاکہ وہ کامل ہو کر ایک ہو جائیں۔"[1]

کیا مسیح یہ دعا مانگ رہے تھے کہ میرے شاگرد اور انکے شاگرد سب خدا بن جائیں؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

لامحالہ ایسا مفہوم لیا جائے گا جو تمام عبارات کے موافق ہو اور وہ ہے مقصد اور ہدف میں ایک ہونا، نہ کہ ہر لحاظ سے ایک ہونا۔ عام محاورہ بھی اسی طرح ہے یعنی جب مقصد اور ہدف ایک ہو تو کہا جاتا ہے کہ "میں اور وہ ایک ہیں۔" اسی باب کے فقرہ ۱۱ کو پڑھیں تو مزید وضاحت ہو جاتی ہے، مسیح علیہ السلام کہہ رہے ہیں: "میں آگے کو دنیا میں نہ ہوں گا مگر یہ (حواری) دنیا میں ہیں اور میں تیرے پاس آتا ہوں، اے قدوس باپ! اپنے اس نام کے وسیلہ سے تو نے مجھے بخشا ہے، ان کی حفاظت کر تاکہ وہ ہماری طرح ایک ہوں۔"

⑥ پولوس نے بھی 'ایک ہونے والی' اصطلاح استعمال کی ہے اور اس نے بھی مجازی مفہوم لیا ہے نہ کہ حقیقی، چنانچہ کرنتھیوں کے نام پہلے خط میں یوں لکھا ہے:

"کیا تم نہیں جانتے جو کوئی کسی سے صحبت کرتا ہے وہ اس کے ساتھ ایک تن ہو جاتا ہے؟ کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ وہ دونوں ایک تن ہوں گے اور جو خداوند کی صحبت میں رہتا ہے، وہ اس کے ساتھ ایک روح ہوتا ہے۔"[2]

اسلام میں بھی اسی طرح کا مفہوم ملتا ہے، چنانچہ حدیثِ قدسی ہے جسے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:.....

"میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو پسند کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے۔

---

۱ انجیل یوحنا ۱۷: ۲۰-۲۳ ۲ ۱-کرنتھیوں ۶: ۱۶-۱۷

اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے... الخ"[1]

بلاشبہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس انسان کے اندر حلول کر جاتا ہے یا بعینہٖ جسم کے اعضا بن جاتا ہے بلکہ یہ مفہوم ہے کہ جب انسان عبادتِ الٰہی میں نہایت جدوجہد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو خاص ملکہ اور تعاون ملتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے اعضا کو اطاعتِ الٰہی میں مگن رکھتا ہے۔

بائبل سے مزید حوالہ جات جن میں 'ایک ہونے' سے حقیقی معنی نہیں مراد لیا گیا:

⑦ "اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔"[2]

⑧ پولوس رقم طراز ہے: "اور تم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا مسیح کو پہن لیا، نہ کوئی یہودی رہا نہ کوئی یونانی نہ کوئی غلام نہ کوئی آزاد نہ کوئی مرد نہ کوئی عورت کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو۔"[3]

⑨ "اور انجیل کے ایمان کے لیے ایک جان ہو کر جانفشانی کرتے ہو۔"[4]

⑩ "پس اگر کچھ تسلی مسیح میں اور محبت کی دل جمعی اور روح کی شراکت اور رحم دلی اور دردمندی ہے تو میری یہ خوشی پوری کرو کہ ایک دل ہو کر رہو، یکساں محبت رکھو، ایک جان ہو۔"[5]

⑪ "کیونکہ ہم سب نے خواہ یہودی ہوں، خواہ یونانی، خواہ غلام، خواہ آزاد ایک ہی روح کے وسیلہ سے ایک بدن ہونے کے لیے بپتسمہ لیا۔"[6]

چوتھا شبہ: قول عیسیٰ علیہ السلام "میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں"

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: "میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے۔"[7]

جواب: یہ اور اس طرح کی عبارات سے مسیحیوں کا استدلال نہایت کمزور ہے کیونکہ

اول: اگر اس جملے کو ظاہر پر محمول کیا جائے تو حلول کا ثبوت لازم آتا ہے جبکہ مسیحی حضرات اس کی نفی کرتے ہیں تو لامحالہ اس کی تاویل کرتے ہیں اور وہ یہ کہ باپ اور بیٹا جوہر میں متحد ہیں یعنی ظاہری لفظ سے گو دو شخصیات ہیں لیکن باطنی اعتبار سے دونوں ایک ہیں کیونکہ ظاہری لفظ سے باپ کا اطلاق بیٹے پر اور بیٹے کا باپ پر نہیں ہو سکتا۔ اور پیچھے یہ بحث تفصیلی گزر چکی ہے کہ باطن (لاہوت) کے اعتبار سے بھی دونوں کا ایک ہونا عقل

---

۱ صحیح بخاری: کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم ۶۵۰۲
۲ پیدائش ۲:۲۴
۳ گلتیوں ۳:۲۷-۲۸
۴ فلپیوں ۱:۲۷
۵ فلپیوں ۲:۱-۲
۶ ۱-کرنتھیوں ۱۲:۱۳
۷ انجیل یوحنا ۱۴:۱۰

و نقل کے صریحاً خلاف ہے۔

دوم: سو جب ہم اس فقرے کے سیاق و سباق اور عہدِ جدید کے دیگر حوالہ جات کو دیکھتے ہیں تو اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسی باب کے فقرہ ۲۰ میں یوں لکھا ہے:

"اس روز تم جانو گے کہ میں اپنے باپ میں ہوں اور تم مجھ میں اور میں تم میں۔"

پچھلے شبہ کے تحت انجیل یوحنا کا ہی حوالہ گزرا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے لیے دعا کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں: "یعنی تاکہ وہ سب ایک ہوں یعنی جس طرح اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں وہ بھی ہم میں ہوں... میں ان میں اور تو مجھ میں تاکہ وہ کامل ہو کر ایک ہو جائیں۔"[1]

ان عبارات کے مطابق: باپ ہے مسیح میں اور مسیح ہے شاگردوں میں۔ جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ باپ ہے شاگردوں میں۔ اس کو منطق (لاجک) کی اصطلاح میں یوں سمجھیں کہ A برابر ہے B کے اور B برابر ہے C کے، لہٰذا A برابر ہوا C کے۔ کیا ہے کوئی مسیحی جو ان جملوں کے سبب حواریوں کو بھی خدا مانے؟

بائبل کے مزید حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

"خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا، اگر ہم ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں تو خدا ہم میں رہتا ہے اور اس کی محبت ہمارے دل میں کامل ہو گئی ہے، چونکہ اس نے اپنے روح میں سے ہمیں دیا ہے۔ اس سے ہم جانتے ہیں کہ ہم اس میں قائم رہتے ہیں اور وہ ہم میں اور ہم نے دیکھ لیا ہے اور گواہی دیتے ہیں کہ باپ نے بیٹے کو دنیا کا منجی کر کے بھیجا ہے۔ جو کوئی اقرار کرتا ہے کہ یسوع خدا کا بیٹا ہے خدا اس میں رہتا ہے۔"

"اور وہ خدا میں، جو محبت خدا کو ہم سے ہے اس کو ہم جان گئے اور ہمیں اس کا یقین ہے، خدا محبت ہے اور جو محبت میں قائم رہتا ہے وہ خدا میں قائم رہتا ہے اور خدا اس میں قائم رہتا ہے۔"[2]

پولوس نے لکھا: "ہم زندہ خدا کا مقدس ہیں۔ چنانچہ خدا نے فرمایا کہ میں ان میں بسوں گا اور ان میں چلوں پھروں گا اور میں ان کا خدا ہوں گا اور وہ میری اُمت ہوں گے۔"[3]

ان حوالوں سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ایمان والوں میں رہنا ان کی مدد و تعاون کرنا اور ان کے ارادے کو اپنے ارادے کے مطابق کرنا ہے۔ اگر اس اتحاد سے اُلوہیت لازم آتی ہے تو پھر تمام حواری، تمام اہل کرنتھیوں، بلکہ تمام نیک لوگ خدا ہوئے۔ اسی طرح جناب مسیح علیہ السلام میں خدا کے ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ ان کا ہر قول و فعل اللہ تعالیٰ کی مشیت، تائید، محبت اور رضامندی سے ہے، نیز ان دونوں کا ہدف و ارادہ بھی ایک ہے۔

---

۱ انجیل یوحنا ۱۷: ۲۱-۲۳

۲ یوحنا کا پہلا خط ۴: ۱۲-۱۶ ۳ ۲-کرنتھیوں ۶: ۱۶